پروفیسر شیرانی

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

ایک قوی ہیکل بزرگ میانہ قامت ذرا سے جھکے ہوئے، گندمی رنگ، سر اور مونچھوں کے بال خانہ دہ، سر پر ترکی ٹوپی، کوٹ پتلون پہنے، بادامی رنگ کے لمبے اونچے بوٹ چڑھائے، ایک خاص انداز میں سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں سٹاف روم سے حبیبیہ ہال کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے ——— ! مجھ سے میرے رفیق نے کہا "یہی حافظ محمود خان شیرانی ہیں۔"

یہ ان سے میرے تعارف کا روزِ اوّل تھا۔ میں اور میرا رفیق اسلامیہ کالج میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان سے میرے تلمذ کا سلسلہ ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں ان سے میرے تعلقات برابر خوشگوار رہے۔ اس لئے مجھے اپنے مخدوم کو جاننے اور پہچاننے کا خوب خوب موقعہ ملا۔ میں اسی اعتماد پر ان کی شخصیت کے متعلق یہ چند صفحات لکھنے پر آمادہ ہوا ہوں۔

حافظ صاحب، حافظ قرآن مجید اور شاید حافظ شاہنامہ بھی تھے۔ اصلاً ٹونک کے رہنے والے، شیرانی الاصل، ان کے بزرگ حضرت سید احمد بریلویؒ کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی کی وساطت سے لاہور میں آکر اورنٹیل کالج میں داخل ہوئے اور منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ نوجوانی میں شاعری بھی کی مگر بعد میں اپنا یہ ورثہ اپنے نامور فرزند اختر شیرانی کو سونپ دیا۔ اور خود تحقیق کی ولایت سنبھال لی۔ "مخزن" میں مضمون بھی لکھے اور نظمیں بھی۔ "شیرِ دکن" ان کی ایک مشہور نظم ہے جو مخزن میں چھپی تھی۔ پھر وہ انگلستان چلے گئے، وہاں کچھ دیر قانون کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ دیر لوزک اینڈ کمپنی کے مشیرِ علمی کے طور پر کام کیا اور اسلامی فنون میں وہ بصیرت پیدا کی، جو مدتوں یادگار رہے گی۔ وہاں سے اپنے وطن ٹونک آ گئے اور کچھ مدت کے بعد اختر شیرانی (داؤد) کو لے کر لاہور میں پھر وارد ہوئے، اور پہلے اسلامیہ کالج، پھر اورنٹیل کالج میں پروفیسر رہ کر ۱۹۴۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انتقال وطنِ مالوف میں ۱۹۴۵ء میں ہوا۔

شیرانی ایک وضعدار، سادہ مزاج مگر غیور طبیعت کے بزرگ تھے۔ وہ لباس میں بھی سادگی پسند تھے اور عام طرزِ ماند و بود میں بھی تکلف اور طمطراق سے نفرت تھی۔ کھانے پینے کی عادتوں میں بھی یہی خصوصیت نمایاں تھی۔ ان کا دسترخوان الوانِ نعمت کی فراوانی کے لئے ضرب المثل تھا مگر وہ خود کم کھانے والے اور دوسروں کو زیادہ کھلانے والے آدمی تھے۔ وہ دوسروں پر احسان کرتے تھے مگر خود زیرِ بارِ احسان ہونے سے بہت بچتے تھے اور جب کبھی بامرِ مجبوری کسی کے ذرا بھی احسان مند ہو جاتے تھے تو اس احسان مندی کے جواب میں ایک کے بدلے دس کے اصول پر عمل کیا کرتے تھے۔

یہ شیرانی صاحب کی عادتوں کا سرسری اجمال ہے جس سے ان کی شخصیت کے چند ظاہری خط و خال نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کی عظمت نمایاں نہیں ہوئی۔ ان کی عظمت ہر عظیم شخصیت کی طرح کچھ تو ان کے عظیم انفرادی کارنامہ ہائے علمی ہیں ہے یا پھر ان انسانی بوالعجبیوں میں ہے جن کے حیرت انگیز تضاد میں بشریت اپنی عظمتوں کے راز آشکار کیا کرتی ہے۔

پروفیسر شیرانی کی سیرت کی بوالعجبیاں جتنی حیرت انگیز ہیں۔ اتنے ہی ان کے کارنامے عظیم اور شاندار ہیں۔ ان کی علمی یادگاریں بہت سی ہیں۔ مگر بڑی یادگاریں ان کی چند علمی تصانیف (پنجاب میں اُردو اور تنقید شعرالعجم) اور ان کا وہ مجموعہ مسکوکات و مخطوطات ہے جو انھوں نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ ان یادگاروں سے ان کی علمی شہرت قائم ہوئی مگر ان کو عظمت اور قبولیت کے مسند پر جس چیز نے بٹھایا، وہ ان کی بلند انسانیت اور شرافت تھی جو موروثی بھی تھی اور اکتسابی بھی۔ اسلاف عالی گوہر تھے۔ اولاد نے بزرگوں کی سب وراثتیں محفوظ رکھیں۔ نیک کام کرنے والے اور نیکی کو پھیلانے والے مروت کے پیکر مجسم۔ نیکی کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کیا عمر بھر نباہنے کی کوشش کی۔ ان کی نیکیوں کی داستان طویل بھی ہے اور سبق آموز بھی ——— مگر میرا قلم ان اسرار کو بے نقاب کرنا نہیں چاہتا جن کو انھوں نے خود ظاہر کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔

پروفیسر شیرانی تکلف کے دشمن کتاب کے دوست اور عمدہ کھیس کے عاشق تھے۔ ان کے یہ میلانات اس زمانے میں بھی ان میں موجود تھے۔ جب مجھے ان کی بارگاہ عنایات میں تقرب نصیب ہوا۔

شاید ۱۹۳۰ء کے مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا کہ میں ان کے ہمراہ پشاور گیا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ پشاور سے غزنوی عہد کے سکے سلاطین ترک کے زمانے کی ہندوستانی فارسی کی کتابیں اور نوشہرہ اور سوات کے بنے ہوئے کھیس حاصل کئے جائیں۔ ۹ بجے صبح گاڑی پشاور چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچی۔ ہم اُتر کر قصہ خوانی کی طرف گئے۔ ایک دکان سے چائے پی۔ اس وقت تک دس بج چکے تھے۔ اب جو شہر کے گلی کوچوں کی گردش شروع ہوئی۔ تو پھرتے پھرتے شام کے پانچ بج گئے ——— مارے تھکاوٹ اور بھوک کے میری حالت غیر ہو رہی تھی مگر شیرانی تھے کہ شوق عجائب انہیں ایک گلی سے دوسری گلی تک اور ایک کوچے سے دوسرے کوچے تک اس طرح کشاں کشاں لئے جاتا تھا کہ مجھے تعجب تو کیا ہوتا پریشانی ہونے لگی۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں صرافوں کی دکانوں میں پہنچ کر وہ اس طرح بیٹھ بیٹھ جاتے کہ میں تھک تھک جاتا مگر وہ تھے کہ ہمت ہارے بغیر کبھی اِدھر کبھی اُدھر چھان پھٹک میں مصروف تھے۔ ؎

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں!

اس سفر میں انھوں نے بہت سی قلمی کتابیں چند نادر سکّے اور متعدد خوش نما کھیس جمع کئے۔ پروفیسر شیرانی عجائب پسندی کا مجنونانہ شوق رکھنے کے باوجود ایک ہوشیار خریدار تھے۔ اور خریداری کے فن میں کئی گُر انھیں یاد تھے چنانچہ وقت ضرورت وہ ان گروں سے خوب فائدہ اُٹھاتے تھے۔ ان کا ایک گُر یہ تھا کہ وہ قلمیات یا مسکوکات خریدتے وقت پہلے سب چیزوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر بے توجہی اختیار کر لیا کرتے تھے بعد میں آہستہ آہستہ بیچ بیچ کر قابل توجہ چیزوں کو دیکھتے جاتے۔ یہ اس لئے کرتے تھے کہ دوکاندار یا ذخیرے کا مالک عموماً گاہک سے اس کی توجہ کی قیمت طلب کیا کرتا ہے۔ جونہی اُسے معلوم ہوا کہ فلاں فلاں مال پر گاہک شوق کی نظر ڈال رہا ہے بس وہیں دام زیادہ کر دیئے۔ شیرانی صاحب کو کئی مرتبہ اپنے شوق بے تاب کا تاوان بھی ادا کرنا پڑا۔ اس کے سبب انھوں نے بھی یہ گُر نکال رکھا تھا۔ چنانچہ دوکاندار کو شاید آخری وقت تک یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ان کی دلپسند چیز کون سی ہے۔

شیرانی صاحب یوں تو درویش مزاج آدمی اور صلح کل بلکہ محبت کل کا مسلک رکھتے تھے مگر علمی لڑائی میں انہیں بڑا مزا آتا تھا چنانچہ تحقیقی اور تاریخی نزاعات اور لڑائیوں میں ان کا جو وقت گزرتا تھا اس میں وہ بہت خوش رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس زمانے میں وہ پروفیسر محمد حبیب

صاحب کے ترجمہ خزائن الفتوح کی اناٹومی یا پوسٹ مارٹم میں مصروف تھے ہر وقت اسی کا تذکرہ ان کی زبان پہ جاری رہا کرتا اور انھیں اس ہنگامے میں ایک خاص خوشی محسوس ہوتی اور اسی خوشی میں ہر شام فلیمنگ روڈ پر ہمیں چائے کی دعوت بھی دی جاتی۔ ان دعوتوں میں میرے علاوہ میرا مرحوم دوست شیخ محمد ابراہیم بھی شریک ہوتا تھا۔ ہم نے ان دعوتوں میں ان سے بہت کچھ سیکھا، چائے بھی پی اور کتابیں بھی پڑھیں۔ شیرانی صاحب اپنی الماریوں سے دھڑا دھڑ حوالے کی کتابیں نکالتے اور سناتے جاتے تھے اور ہر ہر سطر سے غلطیاں نکلتیں غرض بچارے ترجمے کی بُری گت بنائی۔

پروفیسر شیرانی کے تحقیقی طریقِ کار میں خاص اور نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ پرانی تاریخ و تہذیب کی سچائیوں تک پہنچنے کے لئے ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا کرتے تھے جو زمانے کی تاریخ سے متعلق ہیں مگر ان کا خاص طریق یہ تھا کہ غیر تاریخی کتابوں سے بھی تہذیبی رجحانات کا کھوج لگایا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ صحیح مواد عموماً غیر متعلق کتابوں میں ملتا ہے جہاں غیر شعوری طور پر ایسی باتیں درج ہو جاتی ہیں جو باقاعدہ تاریخوں میں سیاسی یا ذاتی اسباب کی بنا پر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔

غرض شیرانی "میدانِ جنگ" میں بڑے خوش و خرّم رہتے تھے۔ خیر حبیب صاحب سے تو ان کی یک طرفہ سی لڑائی تھی کیونکہ ادھر سے جواب کی شاید کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی مگر دار المصنفین والوں سے جو لڑائی ہوئی وہ بڑی معرکے کی لڑائی تھی۔ کیونکہ "شبلی" دبستان جدلیات میں ماہر خیال کئے جاتے ہیں اور سر سیّد کے زمانے سے ان کے تیروں اور تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر نبرد آزما اور صف شکن۔ سید سلیمان مولانا شبلی کے خاص تربیت یافتہ بزرگ تھے۔ ان کے ساتھ مولانا حبیب الرحمان شیروانی ثالث بالخیر ہو کر بھی "شبلی والوں" کے ہی سالارِ قافلہ تھے۔

غرض پنجاب اور اعظم گڑھ کے درمیان "پانی پت" کی سی لڑائی ٹھن گئی۔ اگرچہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ پانی پت کی کونسی لڑائی تھی مگر معرکہ بڑا سخت تھا! اس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے لے کر پروفیسر محمد اقبال (بلکہ خود سر محمد اقبال) اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع تک سبھی شریک تھے اور سبھی نے اپنے اپنے جوہر دکھائے مگر بہادری کے سچے جوہر اگر کسی نے دکھا کر دُنیا کو حیرت زدہ کیا تو وہ پروفیسر شیرانی تھے۔ چنانچہ تنقید شعر العجم اسی جنگ و جدل کا نتیجہ ہے!

ان علمی محاربات میں ہمیں پروفیسر شیرانی کی شخصیت کے علمی اور انسانی خصائص کے بڑے بڑے اسرار معلوم ہوئے ——— مثلاً رات رات بھر بیٹھنا تمام تمام دن نئے نئے حوالوں اور نئی نئی کتابوں کی تلاش، ہر ہر شخص سے اپنے نتائج پر بحث اور مشورہ، ہر ہر لحظہ نیا سگرٹ اور ہر ہر ساعت نئی ڈبیا! مگر اس محنت شاقہ کے باوجود مطمئن اور شگفتہ رہتے تھے، کہا کرتے تھے "سچائی اور صداقت کی جستجو بڑی ہی پُر لطف شے ہے اور غلطی بہ پُر لطف شے ہے تاریخی سچائیوں کے معاملے میں سہل انگاری اور تغافل شعاری اتنی ہی تکلیف دہ بات ہے ——— !" یہ ندوے والے چوٹ اور چٹکی سے کام نکالتے ہیں۔ بھڑک دار عبارت لکھی اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیا ——— ان میں محنتی کوئی نہیں اور یہیں یہ مار کھاتے ہیں"

میں نے حاشیے میں لکھا ہے کہ مضمون نگار کا شیرانی صاحب کی ہر رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں مگر جب میں یہ لکھ چکا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے اس طرح کی جسارت کی ایک مرتبہ سزا بھی مل چکی ہے۔ میں نے جب سر سیّد اور ان کے رفقا کی نثر کے متعلق انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی جو شیخ محمد اشرف صاحب نے چھاپی تو میں بڑی خوشی سے کتاب کا ایک نسخہ لے کر اپنے مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا ہدیہ حقیر پیش کیا ——— ! وہ میری کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میری بے حد حوصلہ افزائی فرمائی ——— یہ ان کی خاص عادت تھی کہ وہ علمی کام کرنے کے لئے (" ——— بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ ہنر کے ساتھ" ——— کے مصداق) سراپا شفقت و محبت ہو جاتے تھے۔ خصوصاً میں ان کی قلبی توجہ اور لطف و کرم کا بے حد ممنون ہوں۔ غرض انھوں نے بہت اچھے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی اور اس سلسلے میں آئندہ کام کے کچھ راستے بھی سمجھائے، جن سے مجھے بڑا اطمینان اور فائدہ ہوا۔

! ——— مگر اس کہانی کی ایک فصل ابھی باقی ہے! ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیرانی صاحب یونیورسٹی لائبریری میں میری میز کی طرف

لے مضمون نگار کا پروفیسر شیرانی کی ہر رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

بڑھے آتے ہیں مگر معمول کے مطابق شگفتہ اور متبسم نہیں۔ میں ابھی ان کے اضمحلال پر غور ہی کر رہا تھا کہ "وہ بالکل میز کے پاس آگئے اور میری پیش کردہ محولہ بالا کتاب یہ کہہ کر میز پر پھینک دی "یہ لو سید اپنی کتاب، عطائے تو بلقائے تو .... بس دیکھ لیا بس دیکھ لیا ...." میں نے پوچھا قبلہ کیا بات ہے کیا قصور ہوا۔ کہا۔ بس دیکھ لیا بس دیکھ لیا ——— میں ان کے پیچھے بھاگا اور کوٹ کے طرفِ دامن کو پکڑ کر اصرار کیا —— قبلہ وجہ تو بتائیے کہ میں ندامت کا اظہار کر سکوں ———! کہا "جانے دو بس دیکھ لیا بس دیکھ لیا۔ تم نے تو میرے مضامین پڑھے ہی نہیں ———! "تم نے میرے مضامین پڑھے ہی نہیں ——" یہ کہہ کر لمبے لمبے قدم اٹھائے اور لائبریری سے باہر ہو گئے اور میں کہتا ہی رہ گیا ؎

لو وہ دامن چھڑا کے چل بھی دیئے
حسرتِ خستہ جان سے کچھ نہ ہوا

اس ناراضگی کی وجہ کیا تھی؟ وجہ وہی کہ میں نے لکھ دیا تھا "کہ مضمون نگار کا شیرانی صاحب کی ہر رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں" یعنی میں نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں شعر العجم اور تنقید شعر العجم کے تبصرے میں لکھ دیا تھا کہ تنقید شعر العجم کی عظمت کے باوجود اور شعر العجم کی غلطیوں کے باوجود شعر العجم بڑی کتاب ہے۔ بس یہ بات شیرانی صاحب کو کچھ ناگوار سی ہوئی۔ وہ سمجھے یا شاید انھیں سمجھایا گیا[1] کہ میں شبلی والوں میں سے ہوں اور اس وجہ سے میں نے تنقید شعر العجم کی مرتبہ شناسی نہیں کی۔ شیرانی صاحب کا رنج اس قرب کی وجہ سے بھی تھا جو مجھے ان کی خدمت میں حاصل تھا۔ اس لئے مجھے اس کا بہت افسوس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مشہور بات ہے کہ تیر جستہ از کمان باز نیاید ——— خیر آخر بڑی مشکلوں سے یہ بھی دیکھا کہ تیر جستہ پھر کمان میں بلکہ ترکش میں آگیا اور میری جان میں جان آئی ———!

پروفیسر شیرانی کی اس قسم کی ناراضگیوں کا تجربہ میرے علاوہ اور احباب کو بھی ہوا۔ میرے دوست ڈاکٹر محمد باقر کو بھی ایک مرتبہ ایسی ہی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ پروفیسر شیرانی ان سے بھی ایک علمی بات پر روٹھ گئے تھے اور بچارے باقر صاحب کو بڑے جتن کرنے پڑے، پھر کہیں جا کر وہ راضی ہوئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر باقر صاحب نے ایک خوشنما کھیس کی پیش کش سے انھیں منایا تھا (کہ یہ ان کی خاص مرغوب چیز تھی) اصل بات یہ ہے کہ مخدومی شیرانی صاحب انتہا درجے کے سچے۔ اور اخلاص مند شخص تھے۔ وہ جن لوگوں سے مراسم رکھتے تھے ان میں ظاہرداری کو مطلق روا نہ رکھتے تھے۔ چونکہ خود ان کا مسلک یہ تھا اس لئے وہ دوسروں سے بھی اسی اخلاص کی توقع رکھتے تھے اور معمولی سی کج روی بھی انھیں مضمحل کر دیتی تھی۔ وہ جس سے خفا ہو گئے بس خفا ہو گئے۔ پھر ان کی ناراضگی آسانی سے دور نہ ہوتی تھی۔ امن اور جنگ، دونوں حالتوں میں وہ بڑے ثابت قدم اور مستقل مزاج تھے۔

کہتے ہیں کہ بچوں اور نوجوانوں کو پڑھانا آسان ہے مگر بڈھوں کو پڑھانا اور ان کی عادتیں بدلنا آسان نہیں لیکن شیرانی وہ اُستاد اور وہ پیرِ طریقت تھے کہ انھوں نے بچوں اور نوجوانوں کی طرح بڈھوں کو بھی پڑھایا اور ان کی عادتیں بھی بدل ڈالیں اور شاید یہ غلط نہیں کہ شیرانی کے پڑھانے سے اگر کسی کو پورا فیض حاصل ہوا تو وہ بڈھوں کو حاصل ہوا ——— وہ یوں کہ وہ جب لاہور میں وارد ہوئے تو انھیں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر بنایا گیا۔ اس حیثیت سے انھیں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبا کو پڑھانا پڑتا تھا ——— مگر سچی بات یہ ہے کہ پروفیسر شیرانی کلاس روم لیکچرار اچھے نہ تھے۔ وہ طبعاً کم گو تھے اور خوش بیانی اور طلاقتِ لسانی کے جوہر شاید قدرت نے اس وجہ سے انھیں عطا نہ کئے تھے کہ وہ زبان سے زیادہ قلم سے کام لیں۔ اور اہلِ طلب کو ان کے کانوں کے بجائے آنکھوں کے راستے متاثر کریں۔ اس سبب سے (جہاں تک میری دیدہ و شنید مجھے سمجھا سکی) عام طلبا ان سے کم مستفید ہوتے تھے لہٰذا ان کا اثر اگر تھا تو ان پختہ عمر اور پختہ کار لوگوں پر جن میں وہ شب و روز اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ اور یہی وہ گروہ تھا جو ان کے اصلی کمالات سے صحیح معنوں میں روشناس بھی ہوا اور فیض یاب بھی۔ ان میں اسلامیہ کالج کے پروفیسروں کا ایک گروہ بھی تھا جن کے دل میں پروفیسر شیرانی نے اپنی

[1] جن صاحب نے یہ کارِ خیر انجام دیا تھا وہ اب بھی بقیدِ حیات ہیں مگر میں نام نہیں لینا چاہتا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔

مثال اور تلقین سے علمی تحقیق کی لگن پیدا کر دی تھی چنانچہ ان میں سے بعض آج تک اسی وادی میں گامزن ہیں اور زمانے کی ناموافقتوں کے باوجود شیرانی کی لگائی ہوئی لگن اور پیدا کی ہوئی دُھن میں برابر آگے بڑھے جا رہے ہیں ——! ان میں ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز ہیں جنھیں شیرانی صاحب کی مصاحبت میں ایسا ذوقِ تحقیق حاصل ہوا کہ اس کے نشے میں وہ آج بھی عہدِ مغلیہ کے تہذیبی ورثوں کی چھان بین اور مطالعہ میں مصروف ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ پروفیسر سراج الدین آذر ہیں جو اب مرحوم ہو چکے۔ یہ شیرانی صاحب کی کتاب دوستی سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے بھی ایک بڑا کتاب خانہ جمع کیا جس میں بڑے بڑے نوادر محفوظ ہو گئے۔ ان کے علاوہ ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی ہیں ان کو بھی خارستانِ تحقیق میں الجھانے والے پروفیسر شیرانی ہی تھے —— ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں مگر سب کے نام گنانا لاحاصل بھی ہے اور دشوار بھی —— یہ سب لوگ زندگی میں ایک خاص راستے پر چل رہے تھے اور راستہ متعین کر چکے تھے مگر شیرانی صاحب کے فیضِ صحبت اور زبان کی تاثیر سے ان پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنے شوق و ذوق کے میدان ہی بدل ڈالے اور وہی کچھ کرنے لگے جو شیرانی صاحب خود کرتے تھے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شخصیت کا کرشمہ کہا جاتا ہے۔ شیرانی صاحب کی سیرت کا یہ وہ جادو ہے جس سے ہر وہ شخص متأثر ہوا جو ان سے چند دن بھی ملا —— اور سچ یہ ہے کہ یہ جادو وہ جادو تھا جو سر پر چڑھ کر بولتا ہو یا نہ بولتا ہو مگر دل میں بیٹھ کر ضرور بولتا تھا۔ اس کا سبب پروفیسر شیرانی کا وہ عشق و جنون تھا جو مسلمانوں کے تہذیبی ورثوں کی بصیرت اور ان کے جوہر کے ادراک نے ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ اس عشق و جنون نے ان کی گفتگو میں ایک خاص طلسمِ تسخیر بھر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی علّامانہ وسعتِ نظر کا بھی خاص اثر پڑتا تھا۔ ایران اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ سے ان کی گہری واقفیت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ وہ اس تہذیب کے عالم ہی نہ تھے عاشق بھی تھے۔ ان کو مسلمانوں کی ثقافت کے زوال کا بڑا رنج تھا اور وہ اس کے آثارِ باقیہ کے تحفظ کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان دنیا کی مہذّب ترین اقوام میں سے تھے۔ انھیں ان کے فنونِ لطیفہ کے مطالعہ کا جو موقعہ ملا۔ اس کی بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کی جمالیاتی اقدار زیادہ صحیح اور ان کا فنی مطمحِ نظر زیادہ درست اور صائب تھا۔ یہ ان کا خاص کام تھا کہ انھوں نے ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے مشترکہ مطالعہ سے ایک تنقیدی نقطۂ نظر کی تعمیر و تشکیل کر لی تھی۔ اسکی بنا پر وہ مسلمانوں کے ذہن اور ان کے شعور کے متعلق بڑی جامع اور نادرانہ معلومات رکھتے تھے۔

میں نے جس انداز میں یہ چند سطور لکھی ہیں ان سے ان کی اس محبت کا اندازہ شاید نہ ہو سکے گا جو انھیں اسلامی تہذیب سے تھی خصوصاً ان کے فنونِ لطیفہ سے۔ انھوں نے مسلمانوں کے فن سکہ شناسی کا بھی خوب مطالعہ کیا تھا اور اس فن کے نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر تھے مگر جب وہ ان سب فنون کی جزئیات پر گفتگو کرنے لگتے تو ان کی آنکھوں میں خاص چمک، اور ان کی باتوں میں خاص تاثیر پیدا ہو جاتی تھی —— ان سے ملنے کا جن لوگوں کو موقعہ ملا۔ ان کو اس چیز نے اتنا متأثر کیا کہ ان کے دل میں بھی ان باتوں کا شوق پیدا ہو گیا۔ لاہور میں ایسے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہو گئی تھی جس کا ہر ہر فرد شیرانی صاحب کے زیرِ اثر کسی نہ کسی موضوع کی تحقیق میں لگ گیا تھا —— ان کی ذات اس زمانے میں علم کا منبع اور ان کا گھر طالبانِ تحقیق کا مرجع بن گیا تھا۔ اس کے لئے ان کا علم بھی سہارا تھا اور ان کا اخلاق بھی!

شیرانی صاحب زندگی کے آخری ایام میں اختر شیرانی سے مایوسی کی وجہ سے بہت کبیدہ خاطر اور افسردہ رہتے تھے مگر کتب خانے کی محبت اور اختر کے بچوں سے وابستگی ان کے لئے کچھ نہ کچھ سامانِ راحت مہیا کرتی رہی۔ یوں بچوں کے ساتھ انھیں عموماً اُنس تھا چنانچہ پروفیسر محمد اقبال صاحب مرحوم کے سب صاحبزادے انھیں اپنے اختر سے کچھ زیادہ ہی عزیز تھے اور یہ برخوردار بھی ان سے اتنے بے تکلف اور مانوس تھے کہ جمعرات یا اتوار کی شام ماڈل ٹاؤن پہنچنے کا جو معمول تھا اگر اس میں کہیں فرق آتا تو بہت بے چین رہتے اور دوسرے دن پروفیسر شیرانی سے خوب جواب طلبی ہوتی۔ غرض یہ کہ شیرانی صاحب کی سیرت بڑی دلکش اور ان کی شخصیت عجب کمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کا علم جتنا وسیع اور گہرا تھا ان کی شرافت اور بلند انسانیت اسی قدر لامثال اور لازوال تھی۔ جن لوگوں کو اپنی زندگی میں ان سے کچھ ربط پیدا ہوا وہ انھیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ بڑے عالم اور محقق تھے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ بڑے پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ ان کی بوالعجبیاں بڑی دلکش نہیں مگر تھے وہ با اصول! ان کی ناراضگی بھی مطابقِ آئین تھی اور ان کی رضامندی بھی مطابقِ آئین —— مگر کونسا آئین؟ آئینِ شرافت! آئینِ انسانیت! یہی دو جملے شیرانی صاحب کی سیرتِ محمود کے کلیدی جملے ہیں۔